

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اشارات

پیشکش اور دل گداز

پاکستان بلکہ پوری دنیا تے اسلام میں اس وقت مغرب سینڈ طبعوں اور اسلام کے علمبرداروں کے درمیان جو نزاع اور کشمکش جاری ہے وہ مسلم ممالک کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں ہے اور اسے جتنی جلدی ختم کیا جائے اتنا ہی یہ اسلام اور دنیا تے اسلام کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ کسی قوم کی اس سے زیادہ بد نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کے اندر خلفشار پیدا ہو جائے اور مختلف گروہ اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے ایک راہ پر لگانے کے بجائے انہیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرنے لگیں۔ چنانچہ ملت کا ہر درو مند فرد اس آویزش کو ختم کرنے کا آرزو مند ہے۔ مگر یہ صورت حال جتنی اندوہناک ہے اتنی ہی پیچیدہ بھی ہے اور اس بنا پر کسی جذباتی فیصلے کے بجائے گہرے غور و فکر کی محتاج ہے۔ اور اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اسے جذبات کی شعلہ فشا نیوں میں جلانے کے بجائے فہم و فراست کی معتدل میزان پر تول کر اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں۔ محض ملک خطرے میں ہے، ملت پر آبی ہے۔ "اسلام ہی ہمارے دکھوں کا مداوا ہے"۔ "اس وقت اتحاد اور یقین کامل درکار ہے"۔ "عوام کی فلاح و بہبود ہمارا نصب العین ہے" کے نعرے ہمارے لیے کسی طرح بھی سود مند نہیں ہو سکتے بلکہ انہیں سن سن کر ہمارے کان پک چکے ہیں اور یہ اپنی معنویت بالکل کھو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ اب ان کھوکھلے نعروں سے بجز اس کے کہ بالیوسی اور قنوطیت میں اضافہ ہو، اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

مثلاً جب ہم یہ سنتے ہیں کہ ملک خطرے میں ہے تو قدرتی طور پر یہ جاننے کے

آرزمند ہوتے ہیں کہ جن لوگوں پر ملک کی حفاظت اور پاسبانی کی براہ راست ذمہ داری عائد ہوتی ہے آخر وہ اس سلسلے میں کس قسم کا ایثار کر رہے ہیں۔ کیا انہوں نے اپنی مٹھرقانہ طرز زندگی کو چھوڑ کر اعتدال پسندانہ طرز زندگی کا آغاز کر دیا ہے؟ کیا انہوں نے اس خطرے کے پیش نظر معاشرے کے مختلف طبقات کے مابین اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے کی ایمانداری سے فی الواقع کوئی کوشش کی ہے؟ کیا انہوں نے اس بات کا کوئی التزام کیا ہے کہ نجلی سطح کے بیوقوف اور عقل و فکر سے یکسر عاری مصاصحین کے زرنے سے نکل کر ان لوگوں کا اعتماد حاصل کریں جو اگرچہ ان کی ناجائز مدد سرائی تو نہیں کرتے مگر ملت کی بقا و فلاح کی سچی تڑپ رکھتے ہیں۔ ملک کے افق پر اگر بیرونی خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں تو ارباب بست و کشاد پر بھی تو کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ ان ذمہ داریوں کے معاملے میں آخر کمیوں بے حس ہیں۔ یہ سوال ہر اس شخص کے دل و دماغ میں خلش پیدا کرتا ہے جو اس ملت کا حقیقی خیر خواہ ہے۔

پھر ان حضرات کے اسلام کے متعلق خوش کن نعرے بھی اب ہیں مسخو نہیں کر سکتے اسلام بلاشبہ ایک خاص انداز فکر کا نام ہے اور اس کا اصل محل انسان کا دل و دماغ ہے لیکن یہ انداز فکر لازماً ایک خاص قسم کے سیرت و کردار پر منتج ہوتا ہے۔ اسے اختیار کرنے کے بعد انسان کے فکر و نگاہ کے زاویے بدلتے ہیں اور اس بنا پر نہ صرف اس کی اپنی زندگی کا پورا ڈھانچا بدل جاتا ہے بلکہ وہ اپنے ماحول میں بھی ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ دنیائے اسلام کے سربراہوں کی اسلام سے محبت اور شفیقتگی بالکل مستم اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا، اللہ اور رسول سے ان کا جذبہ عشق سو فیصدی درست، لیکن انسان اپنے آپ کو یہ سوچنے پر مجبور پاتا ہے کہ جس اسلام کو یہ لوگ ملت کے سارے دکھوں کا واحد علاج سمجھتے ہیں آخر اس نسخہ کیمیا کو آزمانے میں کیوں متامل ہیں۔ چلیے ہم بعض معاملات میں بین الاقوامی حالات کی بنا پر انہیں مجبور بھی سمجھتے ہیں مگر اسلام کے متعلق ان لوگوں کی کارروائیاں

اس نوعیت کی ہیں کہ حسنِ ظن کی آخری حد پر پہنچ کر بھی ہم ان کے لیے کوئی وجہ جواز پیدا نہیں کر سکتے۔ سوو کا مسئلہ تو خیر ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اسے ختم کرنے میں کافی محنت اور وقت درکار ہے۔ لیکن آخر یہ ناچ، گانے اور اسی نوعیت کے لہو و لعب کی دوسری سرگرمیوں کی تو بڑی آسانی کے ساتھ حوصلہ شکنی کی جاسکتی ہے۔ اسلام ان سرگرمیوں کو جس نگاہ سے دیکھتا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، اس مسئلے میں مسلمانوں کے کسی فرقے میں بھی کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ ان پر آشوب حالات میں جب کہ "ملت پر آبنی ہے" اس قسم کی سرگرمیاں ہمارے لیے جان لیوا ہیں۔ اور اس بارے میں تاریخ کا واضح فیصلہ بھی موجود ہے کہ جنگ وریاب نے ہمیشہ قوموں کو ذلت و مسکنت سے ہمکنار کیا ہے۔ انہیں ختم کرنے سے ہماری قومی آمدنی کو بھی کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں مگر ان سب حقائق کو جانتے ہوئے بھی اگر ملت کے سربراہ داسے، درمے، قدمے، سننے ان کی سرپرستی کرنے پر کمر بستہ ہوں۔ تو پھر کسی شخص کے لیے یہ باور کرنا کیونکر ممکن ہے کہ یہ حضرات اسلام کو ہی ملتِ اسلامیہ کے دکھوں کا مداوا سمجھتے ہیں۔

اسی طرح عوام کی فلاح و بہبود کا نعرہ بھی بالکل مذاق معلوم ہوتا ہے۔ وہ عوام جن کی بھلائی مقصود ہے انہیں ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اپنے فطری حقوق تک سے محروم کیا جا رہا ہے۔ وہ اس ملک کے انتظام و انصرام میں کسی حیثیت سے بھی ذخیل نہیں۔ مختصر سا نوکر شاہی طبقہ انہیں جس طرح چاہتا ہے بالکل میکانکی طور پر ہانک کر لے جاتا ہے ان کی گاڑیوں، پینے کی کمائی پر چند خاندان وادعیش دیتے ہیں۔ گرانی نے ان لوگوں کی کمر توڑ دی ہے اور وہ اپنی اولاد کے لیے تعلیم و علاج معالجہ کی سہولتیں تو کیا ان کے جسم و روح کے باہمی رشتہ کو برقرار رکھنے کا سامان بھی نہیں کر سکتے۔ امراء انہیں سر بازار ستاتے ہیں مگر ان کی کوئی شنوائی تک نہیں ہوتی۔ یہ سب اتنے واضح حقائق ہیں کہ انہیں سمجھنے اور جاننے کے لیے عقل کی

کوئی زیادہ مقدار درکار نہیں۔ اس ملک کی عظیم اکثریت اس قسم کے حوصلہ شکن حالات سے دوچار ہے اور اس وجہ سے جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ تمہاری فلاح ہمارا منتہائے مقصود ہے تو وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ملک کی بالادست قوتیں ہماری بے بسی پر ہم سے مذاق کر رہی ہیں۔

کھوکھلے اور مسخور کن نعرے ایک مختصر سی مدت کے لیے تو کبھی مفید ثابت ہوتے ہیں لیکن یہ اُس خلا کو پُر کرنے سے ہمیشہ عاجز رہے ہیں جو عمل کی کمی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جو نعرہ اپنے پیچھے ایک سچا عزم اور اخلاص نہیں رکھتا وہ جلد ہی بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے اور لوگوں کی نظر میں اُس کی حیثیت ایک اضمح کوہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر دنیائے اسلام کے قائدین کو یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس قسم کے نعرے اُن کے عزت اور وقار میں اضافہ کی بجائے اُن میں کمی کا باعث ہو رہے ہیں۔ زندگی بڑے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے اور کوئی اونچے سے اونچا نعرہ بھی ان حقائق کو جھٹلا نہیں سکتا۔ جس خادم کی آپ ہر وقت جوتوں سے تواضع کرتے رہیں، اُسے نہ تو سپٹ بھر کر کھانے کے لیے دیں اور نہ بدن ڈھانکنے کے لیے کپڑا مہیا کریں۔ پھر آپ کو نہ تو اُس کی عزت کا کوئی احساس ہو اور نہ اُس کی آبرو کا کوئی خیال۔ ان روح فرسا حالات میں رکھ کر اگر آپ اس سے یہ فرمائیں کہ اس محل میں جو کچھ موجود ہے وہ بس تمہارا ہی ہے۔ اور تمہارے ساتھ جو نارا سلوک کیا جا رہا ہے اُس میں صرف تمہاری بہتری ہی مقصود ہے تو وہ اسے بجز تمسخر کے اور کس چیز پر محمول کرے گا؟

ہماری دلی تمنا ہے کہ ہمارے رہبر اپنی اس غلط روش کو چھوڑ کر ایک معقول طرز عمل اختیار کریں اور حقائق خواہ کتنے ہی تلخ ہوں، اُن کا سامنا کرنے میں جرات اور تحقیقت پسندی سے کام لیں۔ اُن کے اس تحقیقت پسندانہ رویہ سے اُن کا اعتماد بحال ہوگا۔ لوگوں کے دلوں میں اُن کی قدر و منزلت بڑھے گی اور وہ تاریخ میں قہر اور جبر کی طاقت کی حیثیت سے مشہور ہونے کے

بچاتے عدل و انصاف کے علمبردار اور ایشیا و یورپ کے نفسی کے منظر کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے اور آنے والے انسانی قافلے اُن کے کارناموں سے ہدایت حاصل کیا کریں گے

اس سلسلہ میں سب سے پہلا فرض جو ملت کے رہنماؤں پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف موجودہ صورتِ حال کا صحیح صحیح تجزیہ کر کے اس ملت کے اصل روگ کا سراغ لگائیں بلکہ اس کے عروج و زوال کے اسباب پر بھی ایک تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ کیونکہ جیت تک یہ تجزیہ کر کے فساد کے اصل مرکز کا پتہ نہیں لگایا جاتا کوئی تدبیر بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔ یہ صفحات اس بات کے تو متحمل نہیں کہ ہم موجودہ صورتِ حال کا کوئی تفصیلی جائزہ لے سکیں البتہ چند بنیادی باتیں ہم عرض کر دیتے ہیں جن سے غور و فکر کے خطوط متعین کیے جاسکتے ہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ملتِ اسلامیہ فکر و عمل دونوں اعتبار سے اسلام روز بروز دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ اور اس کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ بھی ایسا نہیں جس کے متعلق ہم پورے یقین اور وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ اُس میں اسلام پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ فکری اعتبار سے اگر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ اسلامی افکار و نظریات کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی خیالات و تصورات بھی بڑے ذوق و شوق سے اپنائے جا رہے ہیں اور اُن کی گرفت اسلامی معتقدات کے مقابلے میں ہم پر کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اسلام کے اساسی تصورات سے لیکر معمولی سے معمولی مسائل تک کے معاملے میں ہمارا طرزِ فکر غیر اسلامی اقدار کا ترجمان ہے۔ توحید، رسالت، ایمان بالغیب، ایمان بالآخرت، ایمان بالقدر الغرض اعتقادات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو غیر اسلامی اثرات سے یکسر پاک اور منترہ ہو۔

ایمانیات سے گزر کر جب ہم عمل کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں صورت حال اس سے بھی زیادہ دگرگوں نظر آتی ہے۔ اسلام جن معروفات کو قائم کرنے کے لیے آیا تھا ان کی طرف سے نہ صرف ہم غفلت برت رہے ہیں بلکہ ان کے بارے میں ہم نے ایک معاندانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے اور جن منکرات کے استیصال کی ہم پر ذمہ داری عائد کی گئی ہے انہیں ہم بڑھ کر سینے سے لگا رہے ہیں۔ آخر دیکھیے کہ کونسی برائی ایسی ہے جو ہم میں موجود نہیں۔ قمار، سود، شراب نوشی، فحاشی اور اسی طرح کی دوسری برائیوں کا ہمارے ہاں عام چلن ہے۔ انہیں دیکھ کر کوئی انسان یقین نہیں کر سکتا کہ ہم کسی لحاظ سے بھی امت وسط ہیں اور ہمارے وجود کی غرض و غایت یہ ہے کہ ہم نوع انسانی کے درمیان حق کے علمبردار کی حیثیت سے کھڑے ہوں۔ اس افسوسناک صورت حال کو کن اسباب نے جنم دیا یہ الگ بحث ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام کے معاملے میں ہم ایک مجرمانہ تغافل کے مرتکب ہیں۔

دوسری طرف جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ملت کو دین برگشتہ کرنے کے لیے جو منظم کوششیں وقتاً فوقتاً کی جاتی رہی ہیں وہ بھی چنداں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ دوسرے ممالک کو تو جانے دیجیے خود اس نیم براعظم میں دیکھیے کہ یہاں جن لوگوں نے اس قسم کا کوئی منصوبہ بنایا وہ قوت و طاقت کے باوجود اسے عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہے، اور ان کے سارے عزائم برباد ہو کر رہ گئے۔

اس معاملے میں سب سے پہلے اکبر نے کوشش کی، لیکن اُس کے ارادوں کو ایک فقیر بے نوانے پروان نہ چڑھنے دیا اور بادشاہ کی موت کے ساتھ ہی اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ بلکہ اُس کی ان کارگزاریوں کا الٹا اثر یہ ہوا کہ دین کے حق میں فضا ہموار ہونے لگی اور شاہ و گدا دونوں کے دل میں دین کے لیے تڑپ پیدا ہوئی اور ان دونوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کی افادیت رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ اونٹنگ نیب

عالمگیر اور شاہ ولی اللہ کی دینی خدمات کو آخر دنیا تے اسلام کس طرح نظر انداز کر سکتی ہے۔

پھر ہم پر ایک منحوس وقت ایسا بھی آیا کہ ہم پر ایک ایسی قوم مستطہ ہو گئی جو ہمارے دینی افکار اور احساسات کو کھینچنے میں اپنی عافیت سمجھتی تھی چنانچہ اُس نے ہمیں مغربی تہذیب کا پرستار بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ اس نے ہمارے معاشرے میں روشنی کے پتھنے مینا رکھے انہیں ایک ایک کر کے گرایا۔ ہمارے مکتب اور مدرسوں کی بیج کئی کے لیے ایک جامع پروگرام تجویز کیا۔ ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ کو ماؤٹ کرنے کے لیے ایک نئی تعلیمی پالیسی وضع کی، اور کروڑوں روپے کے صرف سے اُسے کامیابی کے مراحل تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ہمارے اندر جتنے ذہین لوگ تھے اُن کے ضمیر اور ایمان کے سوڑے کیسے گئے۔ علماء کے اندر نفاق کے مختلف بیج بوئے تاکہ وہ اپنی صلاحیتیں کسی تعمیری کام میں نہ کھپا سکیں بلکہ فروعات میں اُلجھ کر رہ جائیں۔ لیکن اس کی یہ ساری کوششیں بھی مسلم قوم کو تہذیب مغرب کا موہن صادق بنانے میں ناکام رہی ہیں۔ بلکہ مشاہدہ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ عین اس دور میں جب اس تہذیب کی چکا چوند روشنی نے لوگوں کی نظروں کو کھیر کر رکھا تھا اور اس کی برتری منوانے کے لیے بڑی بڑی سلطنتیں اپنے وسائل صرف کر رہی تھیں اس وقت بھی یہ تہذیب ہمارے اندر جڑ نہ پکڑ سکی بلکہ اس کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات نمودار رہے اور اُن تحریکات نے زور پکڑا جو لوگوں کو ان کی دستبرد سے بچانے کا عزم لے کر اٹھی تھیں۔

ایشیائی ممالک کے بارے میں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسے منطقے میں واقع ہیں جہاں کے رہنے والوں کے اندر فطری طور پر مذہبی احساسات موجود ہیں اس لیے مغربی تہذیب کا ان کے دلوں میں سرایت کرنا قدرے مشکل ہے لیکن بڑی جو اس تہذیب کے عین

مغربیوں میں واقع ہے وہاں بھی جدید ترکی کے معمار اور اس کے نجات دہندہ کے ہاتھوں یہ تہذیب نفوذ نہ کر سکی اور وہاں بھی اسلام اور جاہلیت کے درمیان اسی طرز کی کشمکش برپا ہے جو دوسرے مسلم ممالک میں ہمیں نظر آتی ہے۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں دنیائے اسلام کی اصل صورتِ حال۔ یہاں نہ تو اسلام کو پوری کیسوتی سے اپنایا جا رہا ہے اور نہ مغربی تمدن ہی کو پوری طرح قبول کیا جا رہا ہے۔ فکر و عمل کا یہ انتشار اس کے لیے سخت مہلک ہے اور اس نے کروڑوں باشندوں کی صلاحیتوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم کوئی ایسا رشتہ تلاش کریں جس سے تذبذب اور تعطل کی کیفیت دور ہو اور مسلمان اپنی قوتوں کو ایک راہ پر لگا سکیں۔

آئیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ آخر مسلمان اسلام کو کیسے چھوڑ کر مغربی تہذیب کو کیوں اختیار نہیں کرتے۔ اس کی سبب سے نزدیک سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ وہ اپنے پیچھے اپنا ایک شاندار اور درخشاں ماضی رکھتے ہیں۔ وہ اس امر سے پوری طرح واقف ہیں کہ اسی دین کے صدقے میں انہیں دنیا اور آخرت کی فلاح نصیب ہوئی۔ قوموں کی امامت اور قیادت ہاتھ آئی۔ پھر اسی کی بدولت انہوں نے تہذیب و تمدن کے گیسو سنوارے، علم کے صحیح خطوط متعین کیے، عقل کو چارچاند لگائے۔ انسان کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر اسے خدا کی غلامی کے آداب سکھائے۔ الفرض انسانیت کے اندر آج عدل و انصاف، نیکی اور پرہیزگاری، آزادی اور مساوات، عفت اور عصمت کی گنجائش آفریں اقدار موجود ہیں وہ سب کی سب انبیاء علیہم السلام کی مقدس امامت ہیں اور ان میں اسلام کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ مذہب بنی زاری کے اس دور میں بھی اگر مذہبی اثرات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج کا انسان مذہب سے بیگانگی کے باوجود سب سے زیادہ اسی سے متاثر ہے۔ پھر

جس مذہب نے انسانوں کے کسی گروہ کو فرشتے سے اٹھا کر عرش تک پہنچا دیا ہو اُس مذہب کو تیاگ دینا اُس کے لیے کوئی آسان کام نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنے ماضی کی گرفت سے اُس وقت آزاد ہونا چاہتا ہے جب وہ تاریک ہو لیکن اگر ماضی انتہائی درخشاں اور تابناک ہو اور اُس تابناکی نے نہ صرف اُس کی زندگی کو منور کیا ہو بلکہ اُس کے آس پاس کے رہنے والوں کو بھی روشنی بخشی ہو تو اُسے ترک کر دینے کی حماقت وہی شخص کر سکتا ہے جو عقل سے بالکل عاری ہو۔

اسلام نے ماضی ہی میں اپنے ملنے والوں کو سر ملندی عطا نہیں کی بلکہ تاریخ کے ہر دور میں ان کی رہنمائی اور دستگیری کی ہے۔ یہ اسی دین کا اعجاز ہے کہ غلامی کے پُر آشوب حالات میں جب حکمران قوتیں انہیں نیست و نابود کرنے کے درپے تھیں، ان کا شیرازہ ملی منتشر نہ ہو سکا اور اس قوم کے افراد کے اندر کافی حد تک وحدتِ فکر اور وحدتِ احساس باقی رہا، اور اسی قوت کے بل بوتے پر اُس نے باطل کی قوتوں کا بے جگری سے مقابلہ کیا۔ مسلمانوں نے اخلاقی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر جتنے نمایاں کام سر انجام دیتے ہیں دراصل اُن کے پیچھے ہمیشہ ایک ہی چھتتا ہوا احساس کار فرما رہا ہے کہ اُن کی زندگی کا ڈھانچہ ٹھیک اسی پنج پر مرتب نہیں ہے جس پر اسلام اُسے مرتب کرنا چاہتا ہے۔

پھر اسلام کی تابندہ روایات مسلم قوم کے دل و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں سرایت کر چکی ہیں اور یہی اس کی قوت و طاقت کا حقیقی سرچشمہ ہیں جس دین کے ساتھ کسی قوم کا اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہو بلکہ اس کی فلاح و بقا کا سارا دار و مدار اُسی پر ہو اُس سے آخر وہ جان بوجھ کر کس طرح مُنہ موڑ سکتی ہے۔

دوسری طرف اسلام کی جگہ جس تہذیب کا اُسے پرستار بنایا جا رہا ہے اُس میں ایک مسلمان اپنے لیے کوئی وجہ کشش نہیں پاتا۔ یہ تہذیب ملتِ اسلامیہ کے لیے استبداد

کا دیوبن کر آئی، جس نے آتے ہی اس پر فلاکت، ذلت اور مسکنت مسلط کر دی۔ ایک مسلمان جیب بھی اس تہذیب کے علمبرداروں کی مہات پر غور کرتا ہے تو اُس کے روز گئے کھڑے ہو جاتے ہیں اس لیے اس کے دل میں کبھی اس تہذیب کے بارے میں احترام کے جذبات پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس کے تسلط کی ہر کوشش کو وہ استعمار پسندانہ عزائم کی بازگشت سمجھتا ہے، خواہ اس کے مُزکب اُس کے اپنے بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ دیکھیے کہ جو مسلمان اس قسم کی حرکات کرتے ہیں ان کے ساتھ وہ ایک مغایرت اور اھنیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ اُس کے دل و دماغ میں اس تہذیب کی بڑی تلخ یادیں موجود ہیں جو اُس کے خون کو کھولا دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ ایک مسلمان کے لیے یوں بھی اس تہذیب میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ایک سوچنے سمجھنے والے دماغ کو مفتوح کر سکے۔ دنیا میں جس وقت سے یہ تہذیب بٹھری ہے اس وقت سے ذی رُوح انسانوں کے مقابلے میں بے جان سکوں کی قدر و قیمت حیرت انگیز حد تک بڑھنے لگی ہے۔ اس تہذیب نے انسان کو خننا مجبور اور بے بس بنا دیا ہے وہ تاریخ کی ایک نہایت ہی عبرتناک داستان ہے۔ اس کے ضمیر کو بڑی سفاکی کے ساتھ کچلا گیا ہے۔ وہ روٹی کے ایک ایک نوالے کے لیے بے رحم سراپاہ داروں کا دست نگر ہے۔ دولت کے ان مچاریوں نے غریب عوام پر جس طرح عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے اُس سے پوری دنیا واقف ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ ملک کے قوانین ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ عدالتیں ان کی پشت پناہی کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہیں۔ ملک کی انتظامیہ ان کی خدمت اور چاکری کے لیے معرض وجود میں آتی ہے۔ الغرض ان لوگوں نے انسانیت کے ایک عظیم طبقے کو بالکل مجبور محض بنا کر رکھ دیا ہے۔

انسانیت کے ان "کرم فرماؤں" کی سعی و جہد کے نتیجے میں جو نظام حیات پروان چڑھا ہے اوم بیزاری، نیر دست آزادی اُس کی نمایاں خصوصیات ہیں اور اس غازیہ تہذیب

کے نیچے انسانی حرص و ہوا کی قوتیں پوری طرح کار فرما ہیں۔ اس تمدن نے آدمیت کی جس طرح مٹی پید کی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس تہذیب کے گھناؤنے پہلو قریب قریب بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آگئے ہیں اور انہوں نے اُس خود فریبی کے طلسم کو بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے جس میں گرفتار ہو کر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی دولت آفرینی انسانی زندگی کے تمام اخلاقی اور سماجی مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہوگی۔ یہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ اس کا اعتراف مغرب کے بڑے بڑے مفکرین، سائنس دانوں اور ادباء نے کیا ہے۔

اس تہذیب کے بارے میں لے لے کر ایک خوش گن مغالطہ یہ دیا جاتا ہے کہ اس نے انسانوں کے معاشی معیار کو بلند کیا ہے لیکن ایک انسان جب آنکھیں کھول کر اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض فریبِ نظر ہے۔ اس نظام میں بلاشبہ ایک مختصر سے طبقے کو زندگی کی آسائشیں مہیا ہو گئی ہیں لیکن یہ سب کچھ پوری انسانیت کا خونِ نچوڑ کر حاصل کیا گیا ہے۔ چنانچہ امریکہ کے مشہور ناول نگار سنیکلر نے اپنے مختلف ناولوں میں اس کے تاریک گوشوں پر سے بڑی جرأت مندی اور چابکدستی کے ساتھ پر وہ اٹھایا ہے مثلاً اس کے شہرہ آفاق ناول "جنگل" میں امریکہ کے صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام کی اس رقابت اور کشمکش کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس کی بے رحمی اور بے اصولی کے سامنے جنگوں میں حیوانوں کی زندگی جنت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک دوسرے ناول "تیل" میں وہ ان ساری زیادتیوں اور مرموم آزاروں کو طشت از بام کرتا ہے جو تہذیبِ حاضر کے محرکِ عظیم یعنی پٹرول کے بڑے بڑے کارخانہ داروں نے مزدوروں کے ساتھ روا رکھی ہے۔ ایک ناول "روپیہ بکتا ہے" میں اُس نے اس راز کو فاش کیا ہے کہ اس نظام میں آناؤتی رائے کا تصور محض خیالی خام ہے۔ اخباروں کی رائے اور بیشتر کتابوں کی اشاعت بھی دولت کی غلام ہے۔

سرمایہ دار جس طرح چاہتے ہیں راستے عامہ کو اپنے ذوق کے مطابق ڈھال لیتے ہیں یہ لوگ اس مقصد کے لیے محض پریس کی قوت استعمال نہیں کرتے بلکہ سکولوں اور کالجوں کے نصاب، طریقہ تعلیم، نظم و نسق اور استادوں کے تقرر پر بھی اپنا قابو رکھتے ہیں۔ اس اویس نے ایک کہانی کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک سوانح عمری لکھی ہے جس کا نام اسس نے میز نام بخار رکھا ہے، اس میں اس عبرت انگیز حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ اگر کہیں عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور اس زمانہ میں ہو جائے اور وہ امریکہ کی تہذیب کا مشاہدہ کریں جس کی بنیاد بظاہر مسیحیت پر رکھی گئی ہے تو امراد، ارباب سیاست اور کلیساؤں کے پیشواؤں میں زبردست ہلچل مچا ہو جائے اور حکومت مذہبی لیڈروں کی رضامندی سے ان کی انقلابی تعلیم کو خطرناک اور مفاد عامہ کے مخالف قرار دے کر باقوا نہیں قید خانہ میں ڈال دے یا مجبوں قرار دے کر ان کی آزادی سلب کر لے یا ان کے ساتھ وہی شرمناک سلوک کرے جو دو ہزار سال قبل رومیوں نے کیا تھا۔

مغربی تہذیب کے بارے میں یہ حقائق کسی مبالغہ آمیزی پر مبنی نہیں بلکہ یہ وہ عام مشاہدات ہیں جن سے ہر شخص آج پوری طرح باخبر ہے ان کے کھل کر سامنے آجانے کے بعد کوئی ہوش مند قوم انہیں اپنے ہاں دیکھنے کی آرزو مند نہیں ہو سکتی۔ آخر سوچیے کہ چند ماویٰ فواندا اور لڈاؤڈ کے حصول کی انسانیت کو کیا قیمت ادا کرنا پڑی۔ اسے استعماری غلام کا تختہ مشق بنا پڑا، خاندانی نظام کی خود اپنے ہاتھوں بنیادیں مسمار کرنا پڑیں۔ حیوانوں کی طرح نپاٹا چارہ کھا کر زندگی کی بے پناہ مشقتیں اٹھانا پڑیں۔ ضمیر، ایمان اور اسی طرح کے دوسرے لطیف جذبات اور احساسات سے ہاتھ دھونا پڑا۔

ہیں یقین ہے کہ مسلم قوم کی عقل کا ابھی اس حد تک دیوالیہ نہیں نکلا کہ وہ محض ایک مختصر سے طبقے کی مادی خوشحالی کے لیے اپنے ایمان، اپنے دانشاں ماضی کی تابندہ روایات اپنے پاکیزہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اس قسم کے

جتنے تجربات کیے جائیں گے وہ مستقبل میں بھی اسی طرح ناکام ہوں گے جس طرح کہ ماضی میں ناکام رہے ہیں۔ اس حقیقت کو عقلمندی و ذہن نشین کر لیا جائے اسی قدر مسلم قوم کے لیے بہتر ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ قوم مغربی تہذیب کو اپنانے کے لیے تیار نہیں تو پھر یہ اسلام کے معاملے میں کیوں کیسے نہیں ہو جاتی۔ اس کی بھی چند وجوہات ہیں۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ مسلم قوم اس وقت عملاً جو زندگی بسر کر رہی ہے اور جس کا اسلام اُس سے تقاضا کرتا ہے ان دونوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حاصل ہے۔ وقت کی اضطراری چال اپنے ساتھ جو نئے مسائل لے کر آتی ہے علماء نے اُن کی اہمیت کا صحیح احساس نہ کیا اور اُن کے بارے میں کوئی مؤثر رہنمائی نہ دی۔ صنعتی انقلاب کے بعد انسانی معاشرے کے اندر بے شمار پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں مثلاً طاقتور سرمایہ دار اور بے کس مزدور کے باہمی تعلقات، ریاست کی حکایت پسندی اور عوام کی بے بسی، سرمایہ دارانہ نظام کی جکڑ بندیوں اور سود کا پوری معاشی زندگی پر تسلط بے ڈگری معاشی چکر، مسابقت، معاشرتی تحفظ۔ الغرض اسی قسم کے بے شمار مسائل میں سے کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں جسے علماء نے خوش اسلوبی کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے عوام دینی معاملات میں تو ائمہ اور صلحاء کی طرف رجوع کرتے رہے مگر سیاسی اور معاشی معاملات میں خالص دنیا پرستوں کی پیروی کرنے پر مجبور ہوئے۔ چنانچہ اُن کی اجتماعی زندگی میں مغربی تہذیب و مرعیت کے ساتھ سرایت کرنے لگی اور آج حالت یہ ہو گئی ہے کہ اس کے عیب کو جاننے کے باوجود ہم اسے سینے سے لگاتے ہوئے ہیں۔ ہمارے علماء نے کرامتِ حجت تک اسلامی سیاست، اسلامی نظامِ معیشت اور اسلامی نظامِ معاشرت کا صحیح نقشہ ہمارے سامنے پیش نہیں کرتے اور اُن مصائب کا حل نہیں بتاتے جن میں اس وقت انسانیت گرفتار ہے اس وقت تک مسلمانوں کے اندر فکر و عمل کے انتشار کا خاتمہ نہیں کیا جاسکتا۔

مغربی تہذیب نے ہماری اجتماعی زندگی کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ ہمارے افکار و تصورات کو بھی متزلزل کر کے رکھ دیا ہے۔ کفر آج جن راستوں سے ہم پر یلینا کر رہا ہے ہم نے ان کے سدباب کی کوئی موثر کوشش نہیں کی۔ ہمارا نوجوان طبقہ جب بھی روس، جان اسٹوریٹ مل، ہیوم، پریگسٹن، ہیگل، مارکس، ڈارون اور فرائیڈ کے نظریات کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان کی فکری نفسوں کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ چونکہ ہر وقت کے غالب تصورات ہیں اس لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے اثرات قبول کرتا ہے۔ باطل کے یہ افکار و نظریات قریباً دو سو سال سے ہمارے فوجوں کے دماغوں کو مسموم کر رہے ہیں لیکن ہم نے صرف انہیں باطل قرار دینے پر اکتفا کیا ہے مگر ان کے ابطال کی کوئی فکر نہیں کی۔

دین میں بلاشبہ جذبات کا بھی ایک ضروری عنصر شامل ہے لیکن ہم جب تک اپنے معتقدات کے لیے عقلی بنیادیں فراہم نہیں کرتے محض جذبات کے بل بوتے پر انہیں زیادہ دیر زندہ نہیں رکھا جاسکتا۔ مارکس نے تاریخ کی جو مادی تعبیر پیش کی ہے اس کے مقابلے میں ہمارے کسی عالم نے تاریخ کی کوئی ایسی تعبیر پیش نہیں کی ہے جو ایک طرف تو اسلامی تصورات کی شارح اور ترجمان ہو اور دوسری طرف مارکسی تعبیر کو واضح و لائل کے ساتھ جھٹلا سکے۔ ہمارا پرانا علم کلام جس کی مدد سے ہم نے یونانی افکار کی تردید کی تھی، آج ہمارے کچھ زیادہ کام نہیں آسکتا۔ نئی تہذیب نے جن نئے افکار کو جنم دیا ہے ان کے ابطال کے لیے نیا علم کلام درکار ہے۔ اور اس معاملے میں ہم کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکے۔

پھر مسلم قوم کی دین سے دُوری کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس امت کی سیاسی قوت کافی حد تک دین کے خلاف استعمال ہوتی رہی۔ خلفائے راشدین کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار آیا ان میں سے کافی تعداد ایسے افراد کی تھی جنہوں نے ریاست کی قوت کو بجائے دین حق

کی سرلمبندی کے اپنی کبریائی کے چھاٹھ جمانے کے لیے صرف کیا۔ مسلمان حکمرانوں میں اگرچہ ایک دو کے علاوہ کسی کو یہ جرات تو نہ ہوتی کہ وہ دین کی مخالفت کرے لیکن یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کی عظیم اکثریت ان فرائض سے غافل رہی جو دین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کیے تھے۔ اگر یہ حضرات اپنے فرائض کو کما حقہ سراخام دیتے تو ہمیں یہ ذلت اور خواری نہ اٹھانی پڑتی جو ہم اس وقت اٹھا رہے ہیں، ہمارے ہاں آج جو دینداری، خدا خوفی، نیکی اور پرہیزگاری موجود ہے وہ بادشاہوں کی کوششوں کی بجائے ان بوہرہ نشینوں کی سمیت کا نتیجہ ہے جو اپنے پاس کوئی دنیادہی سامان نہ رکھتے تھے۔

الغرض یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسلم قوم کی سیاسی قوت کے غلط استعمال کی وجہ سے اس امت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

مسلمان حکمرانوں کی یہ روش بلاشبہ قابل اعتراض تھی، لیکن جب تک سخت شناسی پر مسلمان متمکن رہے اس وقت تک علماء اور اہل حق کو دینی کام کرنے کے اچھے خاصے مواقع میسر آتے رہے۔ بادشاہ کھل کر دین کی دشمنی نہ کر سکتے تھے پھر ان کے اندر جتنی برائیاں تھیں وہ صرف محلات تک محدود رہی اور عوام پر بہت کم اثر انداز ہوتیں۔ اس کے علاوہ ریاست کا دائرہ کار اتنا وسیع نہ تھا کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں پوری طرح دخل ہوتی۔ چنانچہ علماء ربانی کے لیے تبلیغ اور اشاعت دین کے دروازے کھلے ہی رہتے تھے۔ عوام بغیر کسی شدید مزاحمت کے اسلامی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ بادشاہ اس سے ہی غنیمت سمجھتے تھے کہ سخت و تاج ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے محفوظ ہے۔ اقتدار کے علاوہ باقی معاملات سے وہ کوئی تعرض نہ کرتے تھے بلکہ اہل حق کی ہر طرح معاونت اور دستگیری کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔

مگر اقتدار چھین جانے کے بعد میں جن غیر ملکی طاقتوں نے غلامی کی زنجیریں ابائی صفحہ ۶۸

رہنمائیہ اشارات،

پہنائیں۔ انہوں نے سیاسی قوت کو ایک منصوبے کے تحت دین کو ختم کرنے میں صرف کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہمیں ایسی ہمہ گیر اور کلیمت پسند ریاست کے اندر مقید کر کے رکھ دیا جس میں ہم کسی ایک شعبے میں بھی آزاد نہیں۔ ہم پوری اجتماعی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنے پر مجبور ہیں جس کا یہ کافرانہ نظام ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔

پھر جب ان غیر ملکی طاقتوں نے اقتدار ہمیں واپس کیا تو اس وقت ہم پر اس طبقے کو مسلط کر دیا جو اپنے مزاج، اپنی عادات و اطوار اور اپنے افکار و نظریات کے اعتبار سے انگریزوں سے زیادہ انگریز تھے۔ چنانچہ وہ اسی روش پر قائم رہنے کی کوشش کر رہے ہیں جس پر غیر ملکی سامراج کا مزین تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قومی وسائل دین کی بالادستی قائم کرنے کی بجائے اس کی مزاحمت میں صرف ہو رہے ہیں۔ ان فراہماتوں کے ہوتے ہوئے دین پر چلنا جان جو کھوں کا کام ہے جس کی محبت ہر شخص نہیں کر سکتا۔